

مولانا فراہی کا طریقہ تفسیر*

سید جمال الدین عمری

قرآن مجید ان فقہی کتاب ہے اور قیامت تک کے لیے ہے، یہ علوم و معارف کی ایک پوری کائنات اپنے اوراق میں، اپنے صفحات میں بلکہ اپنی ایک ایک سطر اور اپنے ایک ایک لفظ میں لیے ہوئے ہے۔ اس چشمہ صافی سے جس بندہ خدا کو توفیق ملی بقدر ظرف سیراب ہوا اور دنیا کو بقدر توفیق سیراب کرتا رہا، لیکن اس کی بے پایاں حکمتوں اور باریکیوں کا کون احاطہ کر سکتا ہے؟ حدیث شریف میں آتا ہے:-

لا یشبع منه العلماء ولا یضلق عن كثرة الرد ولا ینقضی عجائبہ
اس سے علماء کا کبھی جی نہیں بھرے گا
بلکہ ان کی طلب باقی رہے گی (کثرت تلاوت سے اس پر بوسیدگی نہ طاری ہوگی اور اس

کے عجائب ختم نہ ہوں گے۔

اس حدیث کو امام ترمذی نے ضعیف قرار دیا ہے^۱ لیکن اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بہت قوی اور حقیقت پر مبنی ہے اس لیے کہ اس کے ساتھ تاریخ ہے قرآن مجید کے نزول پر چودہ سو سال گزر گئے لیکن قرآن مجید کے عجائب نہ ختم ہوئے اور نہ ہوں گے۔ آج بھی کوئی طالب علم اگر غرض اور کیسوئی کے ساتھ اس پر غور کرے تو یقین ہے کہ وہ اس احساس سے کبھی دوچار نہ ہوگا کہ اس بحر بے کراں کو پوری طرح چھان لیا گیا ہے اور اب اس کی شناوری لا حاصل ہے بلکہ نئے نئے حقائق اس پر منکشف ہوں گے اور اس کے

* یہ مقالہ مولانا فراہی سیدنا منقذہ ۸۸۰ھ کو تہذیب (۱) میں پیش کیا گیا۔

^۱ لہ ترمذی، فضائل القرآن؛ اب اجاب فی فضل القرآن۔ لیکن علامہ ترمذی کہتے ہیں کہ اس حدیث کے ایک راوی حارث کو امام شیبی ہجو اقرار دیتے ہیں لیکن ان کی یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ (الجامع لاحکام القرآن جلد اول ص ۴۴)

الفاظ میں پوشیدہ معانی کی وسیع دنیا سے وہ روشناس ہوگا۔

علامہ حمید الدین فرہادیؒ اس کی ایک نمایاں مثال ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی ختم ہونے میں چند ماہ باقی رہ گئے تھے (۱۹۲۳ء) کہ وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئے اس سے پہلے مہران بنید پراتی گوناگوں اور متنوع خدمات انجام پا چکی تھیں کہ اس میدان میں بظاہر کسی نئی تحقیق یا بڑی کامیابی کی توقع مشکل ہی سے کی جاسکتی تھی لیکن مولانا فرہادیؒ کے کارناموں کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے ”کہ ترک الاول للاحقر“

علامہ حمید الدین فرہادیؒ نے قرآن مجید پر غور و فکر ہی کو اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا وہ اسی پر سوچتے اور اس کے متعلقات پر غور فرماتے تھے، ان کی ساری علمی تحقیقات اسی کی روشنی میں ہوتی تھیں جب سے ان کی توجہ قرآن مجید کی طرف ہوئی، اس کے بعد زندگی بھر وہی ان کا موضوع تخصص بنا رہا کسی دوسرے موضوع سے انھیں دلچسپی نہیں رہی اور کسی اور طرف انھوں نے نظر اٹھا کر نہیں دیکھی۔ یہ کیسویں اور انہماک کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب توفیقی ہے وہ تیس سال کے دوران وتواترًا فوتتًا، تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الہی سے اسے اسی ترتیب کے ساتھ جمع کرایا جس ترتیب سے وہ لوح محفوظ میں موجود تھا اور موجود ہے۔ اسی ترتیب کے مطابق وہ پڑھا اور پڑھا یا گیا، آج بھی پڑھا پڑھا جا جا رہا ہے۔ اس ترتیب سے امام رازیؒ، ابوبکر نیشاپوری اور ابن عربی جیسے علماء نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے اور بظاہر صحیح نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن کی آیات میں گہرا معنوی ربط ہے اور اسے انھوں نے تلاش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مولانا فرہادیؒ اسی کے قائل ہیں۔ اسے انھوں نے جس طرح ایک فکر اور فلسفہ کی شکل عطا کی ہے، اس سے ان کی انفرادیت نمایاں ہے۔ مولانا کے نزدیک پورا قرآن ایک مربوط کتاب ہے اور اس کی چھوٹی بڑی سورتیں اس کے ابواب و فصول ہیں، ہر سورت کا سابق اور مابعد کی سورتوں سے گہرا تعلق ہے وہ ایک دوسرے کی توضیح اور تکمیل کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک ہر سورت کا ایک مرکزی موضوع ہوتا ہے جس سے اس کے تمام مباحث براہ راست یا بالواسطہ متعلق ہوتے ہیں، اس سے جیسا کہ مولانا خود درج ہے کہ قرآن مجید مختلف موضوعات اور منتشر مباحث کی جگہ ایک مربوط اور ہم آہنگ کتاب معلوم ہوتی ہے۔ (مقدمہ تفسیر)

مولانا کا طریقہ تفسیر یہ ہے کہ سورت کے داخلی اشارات، اس کے بیانات اور اس کے مجموعی مطالعہ سے وہ اس بات کا تعین کرتے ہیں کہ اس میں اصلاً کس گروہ یا کن گروہوں سے خطاب کیا گیا ہے کن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، کس ذہن و فکر کی اصلاح کی گئی ہے اور کن پہلوؤں سے اہل ایمان کی ہدایت کا سامان کیا گیا ہے، ان سب امور کی روشنی میں مولانا جس طرح آیات کی تشریح کرتے ہیں متقدمین میں اس کی جھلک تو ضرور ملتی ہے لیکن پورے قرآن کو اس انداز میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کو فہم قرآن کی ایک نئی راہ کہنا غلط نہ ہوگا، اس کا دروازہ نہ کبھی بند تھا اور نہ کبھی بند ہوگا۔

تفسیر کا ایک عام اصول یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے اس لیے کہ: "القرآن یفسر بعضہ بعضا" دوسرے ذرائع اس کے بعد آتے ہیں۔ امام ابن تیمیہؒ جو سلف کے بہت بڑے نمائندہ ہیں اور جن کی کتاب و سنت پر بڑی گہری نظر ہے فرماتے ہیں:

فان قال قائل فما احسن	اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ تفسیر کا بہتر
طرق التفسیر فالجواب ان	طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا
اصح الطرق فی ذلك ان یفسر	صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے
القرآن بالقرآن فما اجمل فی	کی جائے اس لیے کہ ایک جگہ اس میں اجال ہے
مکان فانه قد فسرت فی موضع	تو دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی گئی ہے اور
اخر وما اختصر من مکان	جو چیز ایک جگہ اختصار کے ساتھ بیان ہوئی
فقد یسط فی موضع اخر	ہے اسے دوسری جگہ پھیلا دیا گیا ہے اگر اس
فان اعیاك ذلك فعلیك	سے تمہاری دشواری حل نہ ہو تو سنت کو منہ بوجہ
بالسنۃ فانہا شارحة للقرآن	سے پکڑو اس لیے کہ وہ قرآن کی تشریح اور
وموضحة له	اس کی اجمالات کو کھولنے والی ہے۔

یہی بات علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ اور علامہ سیوطیؒ نے الاتقان میں کہی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے نزدیک قرآن و سنت کے بعد اقوال صحابہ تفسیر کا تیسرا ماخذ ہیں فرماتے ہیں کہ اگر قرآن و سنت میں ہیں کسی آیت کی تفسیر نہ ملے تو ہم اقوال صحابہ کی طرف رجوع کریں گے

اس لیے کہ اس سے ان کی واقفیت دوسروں سے زیادہ ہے، انھوں نے ان مخصوص حالات کو بھی دیکھا ہے جن میں قرآن نازل ہوا، پھر یہ کہ انھیں اور خاص طور پر علماء و اکابر صحابہ کو فہم کامل علم صحیح اور عل صلح کی دولت حاصل تھی۔

مولانا فراہی نے تفسیر القرآن بالقرآن پر بڑا زور دیا ہے ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ قرآن ہی سے اس کے مشکل مقامات حل ہوں۔ اس میں شک نہیں اس کے ذریعہ انھوں نے بہت سے عقدے کھولے ہیں۔ وہ جس لفظ پر بحث کرنا چاہتے ہیں پہلے ان تمام آیات کا استقصا کرتے ہیں جن میں یہ لفظ آیا ہے اور پھر اس کے استعمالات پر غور کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی طریقہ قرآنی اصطلاحات اور آیات کے سلسلہ میں اختیار کیا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ سورہ احزاب آیت ۳۳ میں 'اہل بیت' کا لفظ آیا ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد ازواج مطہرات ہیں۔ مولانا فراہی نے اس سلسلہ میں مزید کئی اہم باتیں بتائی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اہل بیت کا لفظ صرف عورتوں (بیویوں) ہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیے (یعنی ایک ہو یا زیادہ) استعمال ہوتا ہے۔ اس کی طرف راجع ہونے والی ضمیر ہمیشہ جمع اور مذکر ہوتی ہے۔ اس کی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس میں عورت کے احترام کا پہلو پایا جاتا ہے۔ اسے انھوں نے قرآن کے استعمالات سے مدلل کیا ہے۔

مولانا سورت کے مرکزی موضوع، آیات کے سیاق و سباق اور نظائر کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور ان ہی کی روشنی میں ان کا مفہوم متعین کرتے ہیں اس سے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ شاید وہ ہمارے تفسیری ذخیرہ کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں یہ خیال اس وجہ سے بھی ہوتا ہے کہ مولانا کے ہاں قدیم مفسرین اور ان کے حوالے بہت کم ملتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے پیش نظر تفسیر کی تمام اہم اور متداول کتابیں رہی ہیں لیکن وہ کسی رکن کو محض اس وجہ سے قبول نہیں کرتے کہ وہ کسی بڑے مفسر کی رائے ہے بلکہ وہ

اس بنیاد پر چلتے ہیں ”ہمدردی و محبت و رحمت“ وہ ان سب کی ریلوں کا جائزہ لے کر کسی نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کتاب تفسیر میں عام طور پر ایک ایک آیت کے ذیل میں بہت سے اقوال اور بہت سی توجیہات ملتی ہیں، مفسرین اپنی تحقیق کی روشنی میں ان میں سے کسی قول کو ترجیح دیتے ہیں، کسی قول کو ضعیف قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ کسی رائے کو جمہور کی رائے کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، کسی کو شاذ رائے کہتے ہیں۔ مولانا فرہادیؒ ان تمام دعوؤں کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ انھیں ایک جوہری کی طرح پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور جس قول کو قرآن کے الفاظ اور اس کے سیاق و سباق سے قریب پاتے ہیں اسے اختیار کرتے ہیں۔

چنانچہ زیادہ تر مواقع پر مولانا کی تائید میں متقدمین کے اقوال میں سے کوئی نہ کوئی قول یا کسی نہ کسی مفسر کی رائے صراحتاً مل جاتی ہے اور بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی آیت کے ذیل میں کوئی قول مولانا کے لیے غور و فکر کی بنیاد فراہم کرتا ہے، اسے وہ دوسری ہم معنی آیات پر بھی منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب اس میں کامیابی ہو جاتی ہے تو اس سے وہ ایک اصول کلیہ وضع کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس طرح کی تمام آیات کی توجیہ کرتے ہیں۔ اس صورت میں وہ اس قول کا غالباً اس لیے ذکر نہیں کرتے کہ وہ کوئی اصول نہیں بیان کرتا، بلکہ اس سے صرف ایک آیت کی توجیہ ہوتی ہے۔ اب ہم بعض مثالوں سے اسے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

سورہ فاتحہ کو قرآن مجید کا دیباچہ کہا جاسکتا ہے، اس کے بعد سورہ بقرہ قرآن کی سب سے بڑی سورت ہے جس میں مباحث اور موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ قرآن کے بیشتر احکام اس میں آگئے ہیں۔ مولانا فرہادیؒ فرماتے ہیں کہ اس سورت میں یہود سے خطاب ہے ان کے فساد اور بگاڑ کو واضح کیا گیا ہے اور ان کی کم زوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کو منصب امامت پر سرفراز کیے جانے کا اعلان ہے۔ اسی ذیل میں بہت سے احکام دئے گئے ہیں۔ سورت کی ابتداء آتھ کے بعد ذلک الکتاب سے ہونی ہے۔ نظر یہ کہ ہذا الکتاب کا موقع تھا، سوال یہ ہے کہ ذلک کیوں کہا گیا؟ زیادہ تر مفسرین نے ذلک کو ہذا کے معنی میں لیا ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ آتھ کی طرف اشارہ ہے آتھ پہلے گزر چکا ہے اس لیے اس کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض مفسرین نے

یہ بھی کہا ہے کہ اس سے پہلے قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہو چکا تھا ذلک سے اس کی طرف اشارہ ہے۔ ان توجیہات سے پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا۔ مولانا فرہادی نے پوری سورت کی روشنی میں اس سے جو بحث کی ہے اس سے ذہن کی گریں کھلتی ہیں۔ مولانا کے نزدیک چونکہ سورت میں خطاب یہود سے ہے اس لیے ذلک الکتاب سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے ذہنوں میں ہے، جس کا ذکر ان کے صحیفوں میں ہے، جس کے بارے میں وہ شک و تردید نہیں کر سکتے۔ اس وضاحت سے آگے کی آیات کی بھی بہترین توجیہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے وہی لوگ تسلیم کریں گے اور اس سے ہدایت پائیں گے جن کے اندر تقویٰ ہے، جو غیب کی حقیقتوں پر یقین اور اللہ کی نازل کردہ تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ مولانا فرہادی کی یہ بات بالکل نئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد ہمیں ابن جریر میں ملتی ہے وہ کہتے ہیں ”وقد قال بعضهم یعنی بہ التوراة والانجیل“ اس کے ساتھ مزید فرماتے ہیں کہ اس تاویل کو مان لیا جائے تو پھر ذلک کی توجیہ کی ضرورت نہیں رہ جاتی اس لیے کہ اس کے معنی یہ ہونے کے ذلک کے ذریعہ ایسی چیز کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے۔

قرطبی کے الفاظ اس سے زیادہ واضح ہیں ”قيل ان الله تعالى قد كان وعد

اهل الكتاب ان تنزل على محمد صلى الله عليه وسلم كتابا فالاشارة الى ذلك الود قال المبرد هذ القرآن ذلک الكتاب الذی تستفتحون به علی الذین کفروا^۱ یہاں ’قيل‘ کے ذریعہ اس قول کے منعت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے لیکن مولانا فرہادی نے اسے کم زور سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا بلکہ اسے اہمیت دی اور اس سے انھیں اس آیت کی توجیہ میں بلکہ پوری سورت ہی کے بارے میں ایک نقطہ نظر قائم کرنے میں غالباً مدد ملی ہے۔ سورہ بقرہ ہی کی آیت ۶۲ ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنَى

۱۔ تفسیر طبری جلد اول ص ۲۲۶-۲۲۷

۲۔ تفسیر طبری جلد اول ص ۲۲۷-۲۲۸

۳۔ تفسیر قرطبی جلد اول ص ۱۵۸

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

اس آیت میں یہود و نصاریٰ اور صابئین کے ساتھ ایمان لانے والوں کے لیے بھی کامیابی کی یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھیں اور عمل صالح اختیار کریں، یہ سوال ذہن میں بار بار ابھرتا تھا اور بہت ممکن ہے اور حضرات کے ذہن میں بھی یہ سوال پیدا ہوا ہو کہ آخر ایمان والوں سے ایمان اور عمل صالح کے مطالبہ کا کیا مطلب ہے؟ ان میں وہ کم زور یاں کہاں سے آئیں جو دوسرے گمراہ فرقوں میں تھیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں معنی ایمان المؤمن فی هذا الموضع ثباتہ علی ایمانہ و ترکہ تبدیلیہ و اما الیہود و النصارى و الصابئین فالصدق بصدقہ صلی اللہ علیہ وسلم و بما جاء به ^۱ زیادہ تر مفسرین نے یہی بات کہی ہے لیکن مولانا فرہیؒ قرآن کے استعمالات کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ قرآن 'الذین امنوا' اور المؤمنون میں فرق کرتا ہے وہ جب الذین امنوا کہتا ہے تو اس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والا گروہ مراد ہوتا ہے اس میں کم زور ایمان اور قوی ایمان والے دونوں ہی شامل ہوتے ہیں۔ اس وضاحت کے ساتھ مفسرین کے ہاں یہ بات نہیں ملتی۔ لیکن علامہ ابن جریر طبری کہتے ہیں: قال سفیان: المراد المنافقون کانہ قال: الذین امنوا فی ظاہر امرہم فلذلک قرنہم بالیہود و النصارى و الصابئین، نشہیں من اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ مِنْ جَمِيعٍ ^۲

اس سے معلوم ہوا کہ الذین آمنوا سے ہمیشہ مخلص اہل ایمان ہی مراد نہیں ہوتے۔ یہ بات حضرت سفیان ثوری نے آیت زیر بحث کے سلسلہ میں کہی ہے لیکن مولانا فرہیؒ نے اسے قرآنی استعمالات کی روشنی میں ایک کلیہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمیں ان کی قرآنی بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ۲۰۸ ہے:

^۱ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۱۴۵

^۲ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۲ ص ۴۲۲

یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً

اسے ایمان والو! اسلام میں پورے
کے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس میں طبری، سیوطی اور بعض دوسرے مفسرین نے 'کافئہ' کو 'سلم' کا حال مانا ہے۔ اس کی رو سے آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ اور اس کی تمام احکام کی پابندی کرو۔ اس لیے کہ بعض احکام کی پابندی اور بعض کی خلاف ورزی اسلام کی روح کے خلاف ہے چنانچہ جلال الدین سیوطی کہتے ہیں:

کافئہ حال من السلم
ای فی جمیع شراعیعہ

'کافئہ' کا لفظ 'سلم' سے حال ہے مطلب
یہ کہ (اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ)

اس کے تمام احکام شریعت کو قبول کرو۔

کافئہ کے معنی جماعت کے ہیں۔ اس کا مادہ کف ہے جس کے معنی روکنے کے ہیں۔ جماعت کو کافئہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ افراد کو گھیرے رہتی ہے۔ الگ ہونے نہیں دیتی۔ مولانا فری کے نزدیک کافئہ ادخلوا کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ تم سب کے سب اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ زخم شری نے پہلے اسی کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

کافئہ لا یتخرج احد منکم
میدۃ عن طاعته

سب کے سب۔ تم میں سے کوئی بھی
اس کے دائرہ اطاعت سے باہر قوم نہ نکله۔

اس کے بعد کہتے ہیں کہ دوسرا مفہوم بھی صحیح ہے۔

ویجوز ان یکون کافئہ حال
من السلم۔۔۔ علی ان المؤمنین
امرو ابان مید خلوا فی الطامات
کلہا وان لامید خلوا فی طاعۃ
دون طاعۃ او فی تنعیب
الاسلام و شراعیعہ کلہا

اس کی بھی گنجائش ہے کہ 'کافئہ'
کا لفظ 'سلم' سے حال ہو مطلب یہ کہ مومنوں
کو اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ اسلام میں
پوری طرح آ جاؤ، اس کے تمام احکام کی
اطاعت کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک حکم کو
مابین دوسرے کو نہ مانیں۔ یا یوں کہنا چاہیے

وان لا یجسروا لشیئ منہا لہ
اسلام اور اس کے تمام قوانین پوری طرح
اختیار کریں۔ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں۔

گویا مولانا فراہیؒ نے عام مفسرین کے اختیار کردہ مفہوم کے مقابل میں اس مفہوم کو اختیار
کیا ہے جسے زنجیری نے ترجیح دی ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت ”لا اکراہ فی الدین“ (۲۵۶) کا یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ دین کے
قبول کرنے پر کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی ہر ایک کو آزادی حاصل
رہے گی۔ مولانا فراہیؒ کے نزدیک اس میں جبر فطری کی نفی ہے یعنی اللہ نے کسی انسان کو دین
قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا ہے بلکہ اسے آزاد پیدا کیا ہے کہ وہ چاہے تو دین کو اختیار کر لے اور
چاہے تو نہ کرے۔ مولانا کی یہ تفسیر بظاہر نئی ہے لیکن بعض قدیم مفسرین نے اسے اختیار کیا
ہے چنانچہ زنجیری کہتے ہیں لا اکراہ فی الدین ای لم یجبر اللہ امر الا ایمان علی الایہاب
والنفسر ولکن علی التمکین والاختیار ونحوہ قولہ تعالیٰ ولو شاء ربک لآمن من فی
الارض کلہم جمیعاً افاقت تکوہ الناس حتی یقولوا مومنین ای لو شاء لقتسر ہم
علی الایمان ولکنہ لم یفعل وبنی الامر علی الاختیار۔ یہی نہیں بلکہ اس آیت کی عام
طور سے جو تفسیر کی جاتی ہے اسے زنجیری نے کم زور قول کی حیثیت سے پیش کیا ہے قول
ہو اخبار فی معنی النہی ای لا تکرہوا فی الدین ثم قال بعضہم ہو منسوخ لبقولہ
جاہد الکفار والمنافقین واغلظ علیہمؓ

یہ سورہ بقرہ کی بعض آیات تھیں۔ اب ہم سورہ نبی اسرائیل کی دو آیات کا حوالہ
دیں گے۔ اس ذیل کی پہلی آیت ہے۔

وَإِذَا أَرَادْنَا أَنْ نَهْلِكَ قَرْيَةً
أَمْرِنَا مُتَرَجِّمَهَا فَفَسَّخُوا
فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ
فَكَذَّبْنَاهَا تَدْمِيرًا ۝ (۱۶)

جب ہم کسی سٹی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں
تو پہلے اس کے نوٹس حال لوگوں کو حکم
دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانی کرنے لگتے
ہیں۔ اس کے بعد عذاب کا فیصلہ اس پر چھپا
ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

۱۰ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳۵۳/۱

۱۱ الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳۸۷/۱

اس آیت کے تین مفہوم بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جب کسی بستی کی ہلاکت کا وقت قریب آن لگتا ہے تو ہم اس کے آسودہ حال لوگوں کو فسق و فجور کا حکم دیتے ہیں اور وہ اس کا ارتکاب کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ زمخشری کہتے ہیں۔

امرناھم بالفسق ہم نے انھیں فسق کا حکم دیا اور انھوں نے

ففعلوا اس پر عمل کیا۔

یہاں حکم دینے کا مطلب ہے آسودگی اور خوش حالی کا فراہم کرنا یہ چیز خیر و صلاح کا ذریعہ بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن جب کوئی قوم خوش حالی میں خدا کو بھول جاتی اور فسق و فجور کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو تباہ کر دی جاتی ہے۔ زمخشری کو اصرار ہے کہ آیت کے الفاظ ایسی مفہوم کی تائید کرتے ہیں۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ امرنا، یہاں کثرتا کے معنی میں ہے یعنی جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو اس کے مترفین اور خوش حال افراد میں انفرادہ کرتے ہیں۔ اس کا تیسرا مطلب وہ ہے جو مولانا فرای بیان کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے پہلے اللہ تعالیٰ کا یہ قانون بیان ہوا ہے۔

وماکانا معد بین حتی ہم کسی قوم پر عذاب نہیں نازل کرتے جب

نبعث رسولا تک اس میں رسول بھیج دیں۔

اس قانون کے بیان کرنے کے بعد کہا گیا کہ جب کسی قوم کے آسودہ حال افراد و خواہشات کے پیچھے چلنے لگتے ہیں اور عیش و عشرت اور فسق و فجور میں ڈوب کر ہلاکت کے مستحق ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ انھیں ہلاک کرنے سے پہلے اپنے رسول بھیجتا ہے جو انھیں اس کے احکام و مرضیات سے آگاہ کرتا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ نافرمانی اور معصیت ہی کی راہ اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا قانون اپنا کام کرنے لگتا ہے اور وہ تباہ کر دی جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ انذار کے بغیر کسی قوم پر عذاب نہیں آتا۔ یہ وہ حقیقت ہے جو قرآن کی مختلف آیات میں بیان ہوئی ہے۔

یہی تفسیر عام طور پر مفسرین نے کی ہے۔ جلالین کی مختصر عبارت یہاں نقل کی جا رہی ہے۔

(اورنا مترنیہا) منعیہا
 بمعنی رؤسائها بالطاعة
 علی لسان رسلنا (ففسقوا
 فیہا) فخر جو ا عن امرنا
 ہم نے ان کے مترفین کو یعنی ان کے
 اصحاب دولت اور رؤسا کو اپنے رسولوں کی
 زبان سے اطاعت کا حکم دیا لیکن انھوں نے
 اس میں (استی میں) فوق کی راہ اختیار کی تھی بہار
 احکام سے خروج کیا۔

بعض تفسیری روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورہ نبی اسرائیل کی ایک اور آیت ہے ویسٹونٹ عن الروح قل الروح
 من امری وما ولیکم من العلم الا قلیلا۔ یہاں عام طور پر مفسرین نے روح سے روح
 حیوانی مراد لی ہے مولانا فراہیؒ کہتے ہیں کہ یہ سوال وحی سے متعلق تھا مولانا کے خیال کی تائید
 ایک تو اوپر کے مضمون سے ہوتی ہے دوسرے یہ کہ سلف میں اس رائے کے قائلین موجود ہیں
 علامہ آوسی نے سوال کو روح حیوانی ہی سے متعلق مانا ہے۔ اس پر بڑی تفصیل بحث کی ہے
 لیکن ساتھ ہی فرماتے ہیں قال الحسن وقتادة الروح هو جبرائیل وقد سمی روحانی
 قوله تعالیٰ (نزل به الروح الامین علی قلبک) والسؤال عن کیفیت نزوله والقائه
 الوحی الیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام وقال بعضهم هو القرآن وقد سمی روحا
 فی قوله تعالیٰ: (وکلک اوحینا الیک روحا من امرنا) آگے چل کر یہ بھی بتایا ہے کہ
 یہ مفہوم سیاق کلام سے قریب بھی ہے۔

مولانا فراہی کی عربی لغت پر اس کے ماہرین کی طرح نظر تھی، قدیم عربی ادب کا انھوں
 نے بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا، صحف سماوی سے ان کی براہ راست واقفیت تھی۔
 ان سب سے مولانا نے تفسیر قرآن کے سلسلہ میں مدد لی ہے۔ یہاں صرف تفاسیر سے ان
 کے استفادہ کے طریقے کی وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔

۱۔ جلالین

۲۔ تفصیل کے لیے دیکھئے۔ روح المعانی ۱۵/۲۳

۳۔ روح المعانی جزء ۱۵ ص ۱۵۴